پنجابی میں زبانی تاریخ کی روایت

ڈاکٹر سعید بھٹا

(۱)

زبانی تاریخ کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنی بذات خود تاریخ۔ جب انسان نے ابھی حروف تہجی ایجاد نہیں کیے تھے تو اُس عہد میں بھی خاندان کا کوئی بزرگ نئی نسل کو اُن کے پُرکھوں کے کارنامے سناتا تھا اور نئی نسل ان میں دل چسپی لیتی تھی۔ نئی نسل کے لوگ آنے والی نسلوں کو یہ امانت سونپ دیتے تھے۔ یوں سینہ بہ سینہ زبانی روایتیں منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ انسانی تاریخ کا ایک تکنیکی معجزہ تحریر کا وجود میں آنا تھا۔ فنِ تحریر سے انسانی دانش میں انقلاب آیا۔ مشرق و مغرب میں محفوظ ابتدائی کتابوں پر زبانی روایات کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ پانچویں صدی قبل مسیح کے مورخین ہیرودوتس اور تھیوسی ڈائیڈیز کی تاریخی کتابوں میں زبانی روایات باآسانی مِل جاتی ہیں۔ David Henige نے لکھا ہے کہ:

"Only The works of Herodotus and Thucydides have survived intact and the work of both, each in its own way, presaged much later historical investigation. Both combined the use of oral tradition with information collected personally from informants. By his own account Herodotus travelled widely throughout Asia Minor and the Near East collecting stories about the past and investigating monumental remains there, so that much of what he included in

his work purported to relate to periods many centuries before his own time" (1)

ہیرو دوٹس نے مصر کی کہانیوں اور روایتوں کو اکٹھا کیا اور خصوصاً جنوبی ایشیا کے بارے میں بہت سی معلومات انھیں سے اخذ کیں۔ البتہ تھیوسی ڈائڈیز کا کام اُس سے کافی مختلف اور منفرد ہے۔ اس نے پینی پلوزئن جنگ میں خود بھی حصہ لیا تھا اور جنگ کے سورماؤں کے انٹرویوز اور یادداشتوں کو تاریخ کا حصہ بنایا۔ David Henige ہی کے لفظوں میں :

"Thucydides started recording almost as soon as the war began and continued throughout the 27 years it lasted, wandering from one Greek city to another interviewing participants using these data helped him to include numorous speeches in his work, about which he admitted that he did not aim for 'strict accuracy' but preferred instead to describe what he felt were 'the sentiments most befitting' the occasion on which the speeches were delivered".(2)

تھیوسی ڈائڈیز کے بعد میں آنے والے کئی یونانی اور رومی مورخوں نے تحریری اور زبانی روایتوں کو تاریخ میں استعمال کیا۔ عہد وسطٰی کے یورپی مورخین کے سامنے زبانی روایتوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ اس وقت تک یورپ میں بھی بھاٹوں اور ڈھاڑھیوں کے روایتی خاندان موجود تھے جو شاہی خاندانوں اور ریاست کے اہم امور کے بارے میں معلومات رکھتے تھے۔

"An important early group of what we would call traditional historians were the bards and poets of the Eltic world-Wales, Scotland and especially Ireland. Like many historians of today, these people spoke about the past as a way to earn a livelihood and to gain prestige within their own society."(3)

تاریخ کو یاد رکھنے والے یہ خاندان صرف انگلستان تک ہی محدود نہ تھے بلکہ پورے یورپ کی قوموں میں یہ روایت دیکھی جا سکتی ہے۔

مشرق میں بھی ایسی کتابوں کی کمی نہیں جن کی بنیادیں زبانی روایتوں پر ہیں۔ وید مقدس،

اُپنشد، مہابھارت اور رامائن کو اپنے تاریخی ادوار سے بہت بعد میں تحریری شکل میں محفوظ کیا گیا۔ اسلامی تاریخ میں احادیث مبارکہ کی تدوین زبانی روایت کو انتہائی محتاط طریقے سے محفوظ کرنے کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ مسلمان مورخین نے بھی اپنی تاریخوں میں زبانی روایات پر انحصار کیا ہے۔ ابنِ خلدون غالبًا پہلے مسلمان مورخ تھے جنھوں نے تحریری شہادتوں کو بنیادی ذریعے کے طور پر استعمال کیا ہے لیکن اُن سے پہلے مسلمان مورخین کی تاریخوں پر زبانی روایت کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔

"With the possible exception of Ibn Khaldun, the most influential Muslim historian was al-Tabari (d.923), who undertook the ambitious project of telling 'all that occurred from Adam until the present time' largely on the basis of what was or had been oral tradition. His account of the world before Muhammad consists of a long series of tales about important figures and events that had become part of the popular memory-Biblical personages, Alexander the Great, a few Roman and Byzantine emperors, and the legendary persion rulers. He presented these stories in no particular order and they were natural full of errors, if regarded as history. When al Tabari reached the Muslim era he began to use written sources more freely and he cited variant traditions though he did not attempt to reconcile them. For his own times he began to early directly on eyewitness accounts, often repeating several without stating his own preference, to the point where his work became largely anecdotal" (4)

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے یورپی مورخین نے سرکاری دستاویزات کو تاریخ کا بنیادی ذریعہ تسلیم کیا اور عصری تحریری مواد کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے نتیجے میں مورخین نے اُسی

تاریخ کو مصدقہ تاریخ قرار دیا جو کہ سرکاری ریکارڈ اور بنیادی مواد پر انحصار کرتی تھی۔ عرصہ دراز تک تاریخ کا یہی معیار تسلیم کیا جاتا رہا۔

(۲)

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ زبانی تاریخ کا تصور ہر عہد اور خطے میں موجود رہا ہے لیکن جہاں تک اس کے علیٰحدہ ڈسپلن کا تعلق ہے تو یہ اعزاز پروفیسر ایلن نیون کو حاصل ہے جنھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں علیٰحدہ شعبے کی بنیاد رکھی۔

> "The oral history began at Columbia university in 1948 under the ledership of professor Allan Nevin. The object was to seek accounts that were never recorded, explanations of motives that do not appear on paper, and other elusive elements of history." (5)

زبانی تاریخ کے باقاعدہ ڈسپلن کے طور پر سامنے آنے سے مورخین میں ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ اس بحث، سے تین نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ ایک گروہ نے تو زبانی تاریخ کو سرے سے تاریخ ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ جیسے اے۔جی۔پی ٹیلر نے لکھا ہے کہ:

> "Old men drooling about their youth? No! many might now be slightly, more generous, and admit oral history." (6)

ہومر سی۔ہاکٹ، ایلن جانسن، رابرٹ ایچ۔لوئی نے بھی زبانی تاریخ کی مخالفت میں اتنی ہی شدت سے کام لیا ہے۔ ہاکٹ رقم طراز ہے:

> "The historians can make nothing of them of any positive value, in the absence of corroboratory evidence of a documentary, archaeological, or other kind, for the simple reasons that they can not be traced to their origins and without knowledge of origins the ordinary critical tests can not be applied."(7)

جو مورخین زبانی روایت کے حامی ہیں جب وہ ان خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا

ردِعمل بھی یقینی ہے۔ اس ضمن میں پال تھامپسن کا نام قابلِ ذکر ہے:

"The fact is that the opposition to oral evidence is as much founded on feeling as on principle. The older generation of historians who hold the chairs and the purse-strings are instinctively apprehensive about the advent of a new method. It implies that they no longer command all the techniques of their profession. Hence the disparaging comments about young men tramping the streets with tape recorders, and the grasping of straws of justify their specticism: usually a reminscence (it should be noted) about the inaccuracy of either their own or some other person's memory. Beyond this there is - and not only among older scholars - a fear of the social experience of interviewing, of the need to come out of the closet and talk with ordinary people."(8)

یان وانسینا زبانی تاریخ کا نمایاں مورخ ہے۔ اس نے تاریخ کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں پر کتابیں لکھی ہیں۔ خصوصاً افریقہ کی زبانی تاریخ پر اس نے شان دار کام کیا ہے۔ زبانی تاریخ کے حوالے سے اس کے نقطہ نظر میں توازن پایا جاتا ہے۔

"Where there is no writing or almost none, oral traditions must bear the brunt of historical reconstruction. They will not do this as if they were written sources. Writing is a technological miracle. It makes utterances permanent while not losing any of their faithfulness, even though the situation of immediate intimate communication is lost. Hence, where writing is widely used, one expects very detailed and very diverse sources of information, which also allow for a very detailed reconstruction of the past." (9)

زبانی تاریخ کے ڈسپلن نے علم التواریخ میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ابتدا میں تو تحریری کلچر کے مورخین نے سخت ردِعمل کا اظہار کیا اور ان کے انتہا پسندانہ رویے کے باوجود زبانی تاریخ کا تصور بتدریج مستحکم ہوتا گیا۔ مورخین نے خطۂ ارض پر پانچ ہزار سال تک کی سیاسی تاریخ کی نشاندہی تو کی ہے لیکن کسی قوم کی تاریخ میں مکمل ربط نظر نہیں آتا۔ انسانی حافظے میں محفوظ ذخیروں سے تاریخ کے ان خلاؤں کو پُر کیا جا رہا ہے۔ براعظم امریکہ اور افریقہ کی بعض قوموں میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہی نہیں تھا ان کی تاریخ ان قبیلوں کے حافظوں میں محفوظ ان کا ماضی ہے، اس سے ان کے عروج و زوال اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سامراجی طاقتوں نے جن خطوں پر اپنا تسلط قائم کیا ان کی تاریخ اور ماضی کو بھی اپنے مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھا تاکہ محکوم قوموں میں غلامی کی جڑیں مزید مضبوط ہوں۔ ان خطوں کی مقامی روایتوں کو سامنے رکھ کر نئے زاویوں سے تاریخ کو دیکھا جا رہا ہے۔ زبانی تاریخ سے اس فرد کو بھی زبان ملی ہے جو تاریخی جبر کا شکار ہے۔ تاریخی جبر سے گزرنے والوں کی بپتا جب سے تاریخ میں شامل ہوئی ہے تو طبقاتی معاشروں کے مورخین سٹپٹا اُٹھے ہیں کہ یہ تاریخ کو محدود کرنے والی بات ہے۔ اب 'خاص' لوگوں کی تاریخ کو ہی مرکوز نہیں کیا جاتا بلکہ عوام کا زاویہ بھی تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ وہی عوام ہیں جو لکھ نہیں سکتے۔ اگر لکھ لیتے ہیں تو لکھاری نہیں۔ اس عہد میں زبانی تاریخ کو نظر انداز کرنا پیشہ وارانہ مورخوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

(۳)

زبانی تاریخ کے حامی یا مخالف جب زبانی روایت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس میں دوسری زبانی روایتوں کے ساتھ لوک فن اور لوک ادب بھی شامل ہوتا ہے۔ کیا لوک ادب بھی زبانی تاریخ ہو سکتا ہے؟ مورخین کے نزدیک یہ بھی اختلافی معاملہ ہے۔ جارج لارنس گام نے 'فوک لور' کو تاریخی سائنس کا درجہ دیا ہے:

> "In the meantime it is the constant definition of tradition as worthless, the relegation of worthless history "to the realms of folklore" which does so much harm to the study of folklore as a science because the historian misnames an historical error as

tradition, or fails to discover, at the moment he requires it, the fact which lies hidden in tradition, he must not dismiss the whole realm of tradition as useless for historical purpose." (10)

علم انسانیات کے ماہر رابرٹ ایچ۔لوئی نے امریکن فوک لور سوسائٹی کے صدارتی خطبے میں شمالی امریکہ کے انڈینز پر زبانی مورخوں کی تحقیق کی پُر زور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ فوک لور دیگر سماجی علوم میں تو مددگار ثابت ہوسکتا ہے لیکن اسے تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔

"He further stated that stories of war and quarrels are not records of actual occurrences but are folklore, as attested to by their geographical distribution. Lowie conceded the point that tradition narratives are significant in the understanding of psychological, social and religious phenomena associated with a tribal culture, but he categorically refused to allow any historical credence to the details of the narratives." (11)

فلپ ڈی جارڈن، وائی۔ایم سوکولوف اور زبانی تاریخ کے متعدد مورخین کی رائے ہے کہ لوک ادب کو نظر انداز کر کے حقیقی سماجی اور ثقافتی تاریخ لکھنا ناممکن ہے کیوں کہ اس کی ہر سطر کا اپنے کلچر سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ Montell نے لکھا ہے:

"Russian historical songs have been excellent sources of history when approached by the discarding scholar Y.M. Sokolov described how the tendency of the people to idealize Ivan the Terrible led to a departure from historical truth in one of their songs. In the year 1581 Ivan the Terrible, in a fit of wrath, murdered his son Ivan, but in historical song describing the incident, the anger of Ivan was vented on another son who had been accused of treachry. Other than this one radical departure from reality, soklov contended,

the song preserved a great many of the real circumstances surrounding the event" (12

فلپ ڈی۔جارڈن جو کہ ثقافتی مورخ ہیں ان کی رائے پیش خدمت ہے:

"Folklore grows out of the national experience, Jordan states, and an understanding of oral tradition would greatly contribute to those who wish more clearly to understand the historical narrative" (13)

لوک ادب مذہب، عقائد، تصورات، تہوار، رسوم، رویے، عادتیں، طرزِ زندگی اور معاشرتی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ ایک مکمل اکائی ہے اور زندگی کی تمام ذیلی اکائیاں بڑے ہی نازک انداز کے ساتھ اس سے منسلک ہیں۔ دستاویزات، تحریری مواد یا کاروباری ریکارڈ حقیقت کے کسی ایک جزو تک پہنچنے میں مدد دیتے ہیں لیکن لوک ادب سے اخذ تاریخ کسی قوم کے اجتماعی لاشعور کا اظہار ہوتی ہے۔ لوک ادب فن ہونے کا باوجود ایک غیر ذاتی دستاویز ہوتا ہے۔ اس کو لکھنے والے اس کے کردار بھی ہوتے ہیں اور خود مورخ بھی۔ عوام کی حقیقی تاریخ لکھنے کے لیے لوک ادب بہترین تاریخ کا منبع ہے۔ تاریخ اور دوسرے سماجی علوم لوک ادب سے استفادہ کر کے صحیح نتائج تک تو پہنچتے ہی ہیں لیکن لوک ادب سماجی علوم سے بھی کچھ 'بڑھ' کر ہے۔ یہی لوک ادب کا اعجاز ہے۔

(۴)

خطۂ پنجاب کئی صدیوں تک سامراجی طاقتوں کے زیر تسلط رہا ہے اور پنجاب میں سرکاری زبان کا درجہ بھی انھی طاقتوں کی زبانوں کو حاصل رہا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں جو سہولتیں میسر ہو سکتی ہیں پنجابی کو اس سے دور ہی رکھا گیا۔ نتیجتاً سماجی علوم کے موضوعات پر پنجابی میں بہت ہی کم تحریری مواد میسر ہے۔ پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے سنسکرت، یونانی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں تاریخی کتابیں موجود ہیں لیکن ان تاریخوں کا زاویہ بھی وہی ہے جو سامراجی زبانوں کا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پنجابی کا کلاسیکی ادب، لوک ادب اور زبانی روایتیں ایسا خزانہ ہیں جن کے مطالعے سے پنجاب کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ تشکیل کی جا سکتی ہے۔ زیر نظر مقالہ میں پنجاب کی سماجی اور ثقافتی تاریخ کے دائرہ کار کا تعین تو ناممکن ہے کیوں کہ یہ موضوع

کئی جلدوں کا متقاضی ہے۔ جہاں تک زبانی تاریخ میں سیاسی تاریخ کے حوالوں کا تعلق ہے تو وہ بھی ایک علیحدہ جہان ہے۔ یہاں پنجابی میں زبانی تاریخ کے پوشیدہ امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہی مقصود ہے۔

ہڑپہ کے بارے میں سر الیگزنڈر کننگھم نے یہ پیشین گوئی کی تھی یہاں ایک بڑی تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ بیسویں صدی میں سر جان مارشل نے کھدائی کا کام شروع کروایا تو ماہرین آثاریات نے اسے آریہ سے پہلے کی تہذیب قرار دیا۔ اس سے پہلے عظیم ہڑپائی تہذیب کے بارے میں تاریخ گونگی تھی۔ ڈاکٹر ایف۔اے۔خان نے لکھا ہے:

> "As knowledge always proceeds from the known to the unknown, no particular attempts were made by early archaeologists to trace the earliest remains of civilization on our soil, although some seals with letters in pictographic script attracted the attention of General Cunningham. The existence of seals indicated to him some early civilization and these came from only one place in the Punjab, namely the ancient city of Harappa" (14)

سترھویں صدی کے پنجابی شاعر شاہ مراد (وفات ۱۷۰۲ء) کا ایک شعر ہے:

ستا ایں تاں جاگ عمل سنبھال کے
ہڑپے موہراں پا صراف وکھال کے(۱۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سترھویں صدی تک پنجابیوں کے تحت الشعور میں ہڑپہ موجود تھا اور اس کی کرنسی کو معیاری مانا جاتا تھا۔

آر۔سی۔ٹمپل کی مرتب کردہ 'دی لیجنڈز آف دی پنجاب' میں ایسے ضمیاتی کرداروں کی کہانیاں موجود ہیں جو مافوق الفطرت طاقت رکھتے ہیں۔ یہ دیوتاؤں سے اُلجھتے ہیں اور بالآخر انھیں مغلوب کرنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔ راجا رسالو، راجا نل، راجا ڈھول کی کہانیاں عوام میں آج بھی مقبول ہیں۔ ان کہانیوں میں آنے والے مقامات کی داستان گو نشان دہی بھی کرتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے ان کے زمانے کا تعین کافی مشکل ہے۔ ٹمپل نے سفیدوں اور

ناگاؤں کی کہانی کو آریوں اور پنجابیوں کی جنگ کہا ہے:

"The legends about Safidon, which practically relate the story of the holocaust of snakes by Janamejaya, and the events leading there to, are very widely known throughout the Punjab, and form perhaps one of the most important groups of the legendary lore of the people. The story-overladeu, however, with much subsequent Brahmanical lore- is told in the Adi Parva of the Maha-Bharata, and again partially in the Bhagavata Purana and has been the subject of endless speculation. It no doubt relates the war of extermination carried on by the Aryans about Dehli (Dilli) against the Naga race of the Punjab, and is thus a tale of much historical importance" (16)

ٹمپل کا یہ تبصرہ ابھی تحقیق طلب ہے ہو سکتا ہے کہ آنے والے دور میں اس حوالے سے ٹھوس شواہد مل جائیں۔

پنجابی کی زبانی تاریخ میں ''راجا پورس'' کی لوک کہانی تاریخی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس کہانی میں سکندر مقدونی اور راجا پورس کی دریائے جہلم کے کنارے پر ہونے والی جنگ کے بارے میں کئی تاریخی صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ راجا پورس کی بہادری کی یونانی، لاطینی، سریانی، پہلوی، حبشی اور عربی زبانوں کے مورخین نے تعریفیں کی ہیں۔ پنجابی لوک کہانی کی ان زبانوں میں محفوظ واقعات سے کئی مماثلتیں ملتی ہیں۔ کہانی کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

''سکندر گھوڑے پر چڑھ کر آیا اور پورس ہاتھی پر سوار تھا۔ پورس ہاتھ کو لہرا کر برچھا مارنے کے لیے نشانہ لگانے لگا تو اس کی نظر ہاتھ پر بندھی ہوئی راکھی پر پڑی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہائے زمانے! تمہیں کاٹ ڈالوں۔ اب راجپوت نہیں رہتا اگر سکندر کو مار ڈالوں''۔ (۱۷)

اس کہانی میں راجا پورس کو سکندر مقدونی کے مقابلہ میں اخلاقی طور پر برتر دکھایا گیا ہے۔ یہ اخلاقی معاملہ پنجاب کی عوامی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ لوک ادب میں سماجی قبولیت کا معاملہ بہرحال اہم ہوتا ہے وگرنہ لوک کہانیوں کا سفر ہی رُک جائے۔

پنجابی لوک ادب کی اصناف سُخن لوک کہانی، ساکا، ماہیا، ڈھولا، لوری، گیت، گھوڑیاں، اور بولیاں میں کئی تاریخی حوالے ملتے ہیں جن سے پنجابیوں کے عوامی موقف سے آگاہی ہوتی ہے لیکن وار ایسی صنف ہے جس کا موضوع ہی تاریخ ہے۔ بعض ناقد تو وار کا لفظ ہی تاریخ کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اگر ان واروں کا ارتقائی مطالعہ کیا جائے تو پنجاب کی سینکڑوں سالہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں واریں تو کئی صدیوں سے لکھی جا رہی ہیں لیکن ہم یہاں 'دُلے بھٹی دی وار'، 'نادر شاہ دی وار' اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ڈھولوں کی مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے تا کہ اس روایت کی قدر و اہمیت کا پتہ چل سکے۔

دُلا بھٹی پنڈی بھٹیاں ضلع حافظ آباد کا رہائشی تھا۔ اس کے باپ فرید اور دادا ساندل کو مغلوں نے قتل کروایا تھا۔ دُلا بھٹی بھی مغل حکومت کو مالیہ دینے سے انکار کرتا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں مغل فوجیں پنڈی پر حملہ کر دیتی ہیں۔ دُلے کے ساتھی مغلوں کے ٹڈی دَل کا بے جگری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ دُلا بھٹی کو گرفتار کر کے لاہور میں پھانسی دے دی جاتی ہے۔ اس لوک وار سے سولھویں صدی کی مغل شاہی اور پنجابی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں زندگی کو کس رُخ سے دیکھتے تھے۔ درج ذیل شعروں میں دُلے بھٹی کی ماں اپنے بیٹے مہرو کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتی ہے:

ہتھ بنھ کردی آں بینتی ، سچیاں دیاں سُنا
باہر اُترے پُت مغلیڑے ، دِتی بیٹھے مُچھاں نُوں تاء
کیہ لے بہیں گا محلیے کیہ جگ تے رہسی آ ناں!
لے جان گے پنڈی لُٹ کے ، ہاتھیاں دے ہودیاں چ پا
نونہاں دھیاں لے جان گے بنھ کے کیہ رہسی آ شرم حیا(۱۹)

'نادر شاہ دی وار' پنجابی کے وار ادب میں کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں دہلی دربار کا ماحول، اُمراء کی سازشیں، نادر شاہ کی فوج کشی، ایرانی اُمراء اور فوج کے بارے میں تفصیلات، جنگ کی منظر کشی، حُب الوطنی کا جذبہ اور زبان و بیان کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ہندوستان کے جن اُمراء نے نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کر لیے اُکسایا تھا اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ جیسے ایل۔لاک ہارٹ نے لکھا ہے:

"Another reason for the invasion, according to a

number of contemporary historians and writers, both Indian and European, is that Nadir entered India at the invitation of the Nizamu'l-Mulk, the veteran viceroy of the Deccan, it has also been asserted that Saa'dat Khan, the subadar of Oudh, was jointly responsible with the Nizamu'l-Mulk for inviting Nadir to come."(19)

'نادر شاہ دی وار' میں بھی نظام الملک کو غدار قرار دیا گیا ہے جس نے نادرشاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے تین خط لکھے تھے۔ تیسرے خط کا متن دیکھیں:

رُقعہ لِکھ نظام دین ، ول نادر گھلے
محمد شاہ نہیں بیٹھدا ، وِچ آدر گلے
رعیت نت رنجانی اے ، حق پوے نہ پلے
رستہ چھوڑ چوغطیاں ، کم کرے اوّلے
دِلی فتح آسان ہے ، کر آویں ہلے
پھیرا پاویں اساں دے ، دن ہون سوّلے
اگے حُکم رضا دے ، کوئی عذر نہ چلے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پنجاب کے کئی وڈیروں اور زمینداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا لیکن عوام کی بڑی تعداد نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ پاکستانی پنجاب کے کئی شہروں اور قصبوں میں انگریزں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ انگریز مورخوں کی لکھی تاریخوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی رپورٹوں میں غیور عوام کو جرائم پیشہ قبائل اور مویشی چور وغیرہ کے القابات سے نوازا گیا ہے۔ جن قبائل نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور بعد میں غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کی کوششیں کیں اوہ سامراجی طاقتوں کے لیے یقیناً ناپسندیدہ تھے۔ اینڈریو جے۔ میجر کے لفظوں میں:

"It is not always remembered that under British rule some 150,000 Punjabis were notified under the criminal tribes Act as belonging to tribes and castes whose hereditary occupation was deemed to be

crime" (21)

انسانی تاریخ کے بدترین ادوار میں بھی ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں بعض قبائل کے بچے پیدائشی مجرم قرار دیئے گئے ہوں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں انگریز افسروں کی رپورٹوں میں مقامی سورماؤں کے تشخص کو بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے لیکن ان رپورٹوں کی تہہ میں کہیں کہیں صحیح صورت حال بھی نظر آ جاتی ہے۔ میوٹنی رپورٹ میں لکھا ہے:

"On the very evening of the memorable 14th of September (The assault of Delhi) a Mahemodan official of the postal department arrived at Lahore from Googira, came before the chief commissioner, and reported, with a some what malicious twinkle of the eye, that all the wild and predatory tribess inhabiting the jungly country between Lahore and Mooltan had risen. In reply to a question, he further informed the chief commissioner that the number of the insurgents amounted to exactly 125,000 men" (22)

کیا ایک لاکھ پچیس ہزار لوگ جنھوں نے سید والا سے چیچہ وطنی تک انگریزوں کو گوریلا مزاحمت سے ناکوں چنے چبوائے تھے، سبھی مویشی چور تھے؟ رائے احمد خان کھرل نے راوی کے قبائل کو انگریزوں سے جنگ کے لیے آمادہ کیا تھا۔ ابھی وٹو اور کھرل قبیلے ہی میدان میں اُترے تھے کہ رائے احمد خان گولی لگنے سے شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد راوی کے بیشتر قبائل نے مقابلہ کی ٹھان لی۔ یہ سورما نہ تو تنخواہ میں اضافے کے لیے لڑ رہے تھے اور نہ ہی سماجی رُتبہ کے حصول کے خواہش مند تھے۔ ان میں کوئی پیشہ وارانہ سپہ سالار بھی نہ تھا۔ یہ پنجاب کی دھرتی پر غیر ملکی حملہ آوروں کے منحوس قدم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پنجاب میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد کئی دیہاتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کئی سورما پھانسی لگے۔ کچھ کو جزیرہ انڈیمان بھیج دیا گیا۔ جنگ آزادی کے ان واقعات کی تفصیل لوک روایتوں، لوک کہانیوں اور ڈھولوں میں محفوظ ہے۔ یہی پنجابیوں کا عوامی موقف ہے۔ ایک ڈھولے کا متن پیشِ خدمت

ہے:

کال بُلیندی نارد پیا ونگاردا
ایہناں انگریزاں بلند، بیگ داترہانہ، فتح پور گوگیریں پھاہے چاڑھیا
جیہڑا لاڑا ہا ساندل باردا
ایہناں انگریزاں بنھ لیا لال گاجی دا کاٹھیا، مامد جلے دا کاٹھیا،
ولی داد مُردانہ تے موکھا پتر کوڑھی وہنیوال دا
ایہناں انگریزاں بنھ لیے، مراد تے بہاول فتیانے،
جیہڑے راوی دے اُتے چلکیندے مال چودھاردا
پنڈی شیخ موسیٰ دے وچوں، نادر شاہ قریشی ٹوریونیں،
پنچھی نکھیڑیا ہنساں دی ڈاردا
پیریں بیڑیاں، ہتھیں کڑیاں جھل کے، فرض نبھائی جاندے نی رب غفاردا

اس وقت جو نسلیں میڈیا کے زیر اثر پروان چڑھ رہی ہیں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے جو جبر اور استحصال روا رکھا ہوا ہے۔ ٹیکنالوجی کے ساتھ نئی نسل پرانی نسل کی جگہ لے رہی ہے۔ نئی نسل کا ماضی سے رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ موجودہ دور میں ہم یورپ اور امریکہ کا مقابلہ ٹیکنالوجی اور سائنس کے میدان میں نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس اپنا ثقافتی ورثہ ہے، جو انسانی حافظے میں محفوظ ہے۔ اگر ہم اسے آڈیو، وڈیو یا تحریری شکل میں محفوظ کر لیتے ہیں تو شاید ہمارے قومی کردار میں جان پڑ جائے۔ ممکن ہے ہم جبر اور ظلم کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر سکیں۔ زبانی تاریخ سے ہماری ثقافت طاقتور اور بھرپور ہو سکتی ہے۔

حوالے:

1- David Henige, Oral Historiography (London: Longman, 1982)7-8.

2- Henige 8.

3- Henige 9.

4- Henige 11-12.

5- M.L.Kachroo, "Scope and Value of Oral History", The Punjab Past and Present, 38 (1985) 257.

6- Gwyn prins, "Oral History" ed. peter Burke, Historical writting (pennsylvania: The pennsylvania state University press, 1992) 144.

7- Lynwood Montell, "Preface to the Saga of Coe Ridge", eds. David K.Dunaway,Willa K.Baum, Oral History An Interdisciplinary Anthology (New York: Altamira, 1996)177.

8- Paul Thompson, The Voice of the Past (Oxford: Oxford University press,2000) 81.

9- Jan Vansina, Oral Traditon As History (Wisconsin: The university of Wisconsin press, 1985) 199.

10- George Laurence Gomme, Folklore as an Historical Science (London: Methuen & co, 1908).

18- June.2007<http://www.pgdp.net>

11- Montell 177-78.

12- Montell 179.

13- Montell 180.

14- Dr F.A Khan, The Glory that was Harappa (Karachi: Department of Archaeology, n.d) 7.

۱۵- ریاض چشتی، جمیل ہاشمی، باغ حسین کمال، مرتبین، کلام شاہ مُراد (چکوال: اردو مجلس، ۱۹۶۶) ۱۴۳۔

16- R.C.Temple, The Legends of the Punjab vol 1, (Islamabad: Institute of Folk Heritage, 1981) 414.

۱۷- سعید بُھٹا، کمال کہانی (لاہور: سانجھ، ۲۰۰۶ء) ۴۴۔

۱۸- احمد سلیم، مرتب، لوک واراں (اسلام آباد: نیشنل کونسل آف دی آرٹس، ۱۹۷۱ء) ۴۷۔

19- L.Lockhart, Nadir Shah (Lahore: Al-Irfan, 1976) 123-24.

۲۰- نواب سیال، مرتب، نادر شاہ دی وار (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹ء) ۸۸-۸۷۔

21- Andrew J.Major "State and criminal Tribes in Colnial Punjab:

surveillance, control and reclamation of the 'dangerous classes", Modern Asian Studies 33.3(1999) 675.

22- Mutiny Reports from Punjab & N.W.F.P vol 2 (Lahore: Al-Biruni,n.d) 358.

۲۳- اے۔ڈی۔اعجاز، مرتب، کال بُلیندی (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۶ء) ۱۷۱۔

